اداریہ

مشرقِ وسطیٰ کا المیہ اور اینگلو امریکن سیاست

آخر نصف صدی کی خرابیٔ بسیار کے بعد اہلِ یورپ نے اس حقیقت کو تسلیم کر ہی لیا کہ ''اسرائیل عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے — شمالی کوریا، ایران اور امریکہ سے بھی بڑھ کر۔'' یہ بات برسل (بلجیم) سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہی گئی ہے۔ کیا اسرائیل عالمی امن کے لیے ایک خطرہ ہے؟ اس سوال پر رائے شماری میں حصہ لینے والوں کی ۵۹ فیصد نے ہاں میں جواب دیا ہے۔

اِدھر ۱۹۴۸ء سے اسرائیل فلسطین میں جس بے رحمی سے اہلِ فلسطین کو رسوا کر رہا ہے، اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہم نے بھی اس المیہ کو خود غزہ میں رہ کر دیکھا ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ بش انتظامیہ اس المیہ پر خاموش ہے۔ نہ تو اسے فلسطین کی سرزمین پر بسائی جانے والی یہودی بستیاں نظر آتی ہیں اور نہ ہی فلسطین کی سرزمین پر اُٹھائی جانے والی 'حفاظتی دیواریں' جنہیں اسرائیل ''خودکش حملوں'' سے بچنے کے لیے تعمیر کر رہا ہے۔ ساری دنیا ان دونوں اقدامات کو ظلم وستم کی علامت قرار دے رہی ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اہلِ فلسطین پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم پر خود اسرائیل کے بعض انصاف پسند شہری بھی تڑپ اُٹھے ہیں اور اسرائیلی فوج کے بعض جوانوں نے غزہ میں اسرائیلی فوج کی ظالمانہ کارروائیوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہر سوسائٹی — مشرقی ہو یا مغربی، مسلم ہو یا غیر مسلم — ایسے اہلِ جنوں سے خالی نہیں ہے جو سچائی سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتے ہیں اور جھوٹ، ظلم اور پاپ کو زندگی کی توہین

قرار دیتے ہیں۔

برسل سے جاری ہونے والے اس بیان نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اہلِ یورپ مشرقِ وسطیٰ میں اینگلو امریکن سیاست کے خوف ناک نتائج سے آگاہ ہیں جو فلسطین میں اسرائیل کی منظم دہشت گردی کی برابر حمایت کر رہی ہے۔ بے شبہ آج اسرائیل اپنے جنگی جہازوں اور امریکی فوجی طیاروں F-16 کی برتری سے فلسطین میں جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ اور اس نے فلسطین کی پوری سرزمین کو ایک قید خانہ میں بدل دیا ہے۔ بش انتظامیہ کو یقین ہے کہ اہلِ فلسطین ایک دن اپنے جان و مال کے تحفظ کے لیے اسرائیل کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے، لیکن وقت بتائے گا کہ جب ایک قوم اپنی آزادی کے لیے سربکف میدانِ کارزار میں اترتی ہے تو پھر تقدیر کو سرنگوں ہونا پڑتا ہے اور ہاتھ پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں:

اذا الشعب یوماً اراد الحیاۃ فلا بدّان یستجیب القدر

چنانچہ اسرائیل کی دہشت گردی کے خلاف اہلِ یورپ نے جو فیصلہ دیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تاریخ کے فیصلوں سے آگاہ ہیں، اور یہ وقت ہی بتائے گا کہ آج اسرائیل فلسطین میں جس راہ پر چل رہا ہے، وہ فرعون کی راہ ہے۔ اس لیے اسرائیل کو بھی کل وقت کے ہاتھوں ذلت و نامرادی کا جام پینا پڑے گا۔

قرآن مجید نے سورۂ بنی اسرائیل میں یہود کے فتنہ و فساد کا ذکر کرتے ہوئے دو واقعات کا ذکر فرمایا ہے کہ کس طرح پاداشِ عمل میں یہودیوں کو مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم نے پھر برائی کا رُخ کیا (ان عدتم، عدنا) تو خدا کا قانونِ مجازات بھی واپس لوٹ آئے گا۔ اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں۔ الیس الصبح بقریب۔ (سورۂ ھود:۸۱)

اس نازک وقت میں مسلم دنیا کے اربابِ سیاست اور اہلِ دانش کا فرض ہے کہ وہ مسلم اور عرب سوسائٹی کو درپیش تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور ان اسباب کا سراغ لگائیں کہ آخر زمانہ ہمارے ہی درپے آزار کیوں ہے؟ ہم نے بار بار

لکھا ہے کہ ہماری زندگی کی سب سے بڑی جنگ خود اپنے آپ سے ہے۔ جب تک ہم پوری تن دہی سے اپنی معنوی بیماریوں — جھوٹ، حسد، لالچ، نفرت، تشدد اور اخلاقی ذمہ داری کے فقدان — پر قابو نہیں پاتے، اس وقت تک ہمارا اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی نظام ہمارے قومی مسائل حل کرنے میں قطعاً ناکام رہے گا۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''جس نے اپنی روح کو پاک رکھا، وہ مراد کو پہنچا، اور جس نے اپنی روح کو گناہ سے آلودہ کیا، وہ (زندگی میں) ناکام رہا۔'' (سورۃ الشمس:۱۰) ہماری ۵۶ سالہ اجتماعی زندگی اس دعویٰ کی صداقت پر گواہی دے رہی ہے۔

اگر ہمارا حالیہ سیاسی اور معاشی نظام کامیاب ہوتا، پھر نہ تو ہمارے بنگالی بھائی ہم سے الگ ہوتے اور نہ ہی ہمارے عوام کی بڑی تعداد کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بار بار مرنا پڑتا اور نہ ہی ہمارے مرحوم دانشور عبدالحفیظ کاردار کو پیشہ ور ماہرین کی ناکامیوں پر Failed Expectations (ناکام تمنائیں) کے نام سے کتابیں لکھنا پڑتیں۔ کیا ہم نے اپنی ناکامیوں سے کوئی سبق سیکھا؟ صد افسوس! ہماری تاریخ اس کا جواب نفی میں دے رہی ہے۔ علامہ اقبال نے آج سے بہت پہلے نہایت ہی دُکھ کے ساتھ کہا تھا: ''ہماری راہ میں جو مشکلات حائل ہیں، مجھے ان کا احساس ہے، یہاں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم نے اپنے مسائل پر قابو نہ پایا تو دنیا جلد ہی ہم سے اپنی جان چھڑا لے گی۔''(۱)

یاد رہے کہ اس خطے میں اور ممالک بھی ہیں، جو مغربی سامراج سے آزاد ہونے کے بعد اپنی قومی زندگی میں نئے نئے مسائل سے دوچار ہیں۔ لیکن وہ کسی حد تک اپنے مسائل حل کرنے میں کامیاب رہے، کیوں کہ اُنہوں نے آزادی کے بعد نہ صرف زرعی اصطلاحات (Land Reforms) جاری کیں، بلکہ تعلیم (Mass Education) کو عام کرنے میں بھی کامیاب رہے اور اس طریق سے اُنہیں جاگیردارانہ کلچر سے نجات ملی۔ افسوس! قومی اصلاح کا

(1) "I am quite sensible of the difficulties that lie in our way, all that I can say is that if we cannot get over our difficulties, the world will soon get rid of us.", p. 97. (*Speeches, Writings and Statements of Iqbal*, Edited by: Latif Ahmed Shirwani, Lahore)

یہ عمل بوجوہ پاکستان میں شروع نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ ہمارے پڑوسی ملک ہماری طرح آزادی کے بعد ان ملکوں کے فوجی حلیف نہیں بنے، جن سے ہم نے بڑی جدوجہد کے بعد آزادی حاصل کی تھی۔ ہماری آزادی نے ابھی سات سال ہی بسر کیے تھے کہ ہمارے اربابِ اختیار نے پاکستان کو معاہدہ بغداد اور سینٹو سے منتھی کر دیا، جس کی وجہ سے ہمارے تعلقات نہ صرف آنجہانی سویت یونین سے خراب ہوئے، بلکہ عرب ملکوں سے بھی کشیدہ رہے۔ مثلاً ۱۹۵۶ء میں مرحوم جمال عبدالناصر نے جرأتِ قلندرانہ سے کام لیتے ہوئے نہر سویز پر جائز طور پر قبضہ کر لیا، جس پر اینگلو فرنچ سیاست نے سو سال سے تسلط جما رکھا تھا۔ حلفِ بغداد نے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ ناصر کے اس تاریخی قدم کی مذمت کرے، چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ بعد میں مرحوم صدر جنرل محمد ایوب خان نے نہ صرف مشرقِ وسطیٰ میں ناصر کے کردار کو تسلیم کیا، بلکہ خود قاہرہ جا کر قاہرہ یونیورسٹی میں ایک تاریخی تقریر بھی کی۔

القصہ ہمیں اپنے قومی اور ملّی تحفظ کے لیے صحت مند جمہوری، اخلاقی اور معاشی قدروں پر ایک فلاحی ریاست کو استوار کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ فلاحی معاشرہ ہی ہمارے کروڑوں عوام کے تعلیمی، معاشی اور طبی مسائل حل کر سکتا ہے۔ یہی فلاحی معاشرہ ہے، جس کے بارے میں اقبال نے مارچ ۱۹۳۲ء میں ایک مسلم اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''میری رائے میں ہندوستان میں اسلام کا مستقبل پنجاب کے کسانوں کی آزادی پر موقوف ہے۔''(۱) چنانچہ پاکستان کے کاشت کاروں کی آزادی کے لیے ایک مربوط اقتصادی پروگرام بنانا وقت کا تقاضہ ہے۔ ایسا معاشرہ قائم کرنے میں ہم نہ صرف برطانیہ، ناروے، ڈنمارک اور سویڈن بلکہ چین، ویت نام اور کیوبا کے تجربوں سے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہی ایک راہ ہے، جس پر چل کر ہم اہلِ پاکستان کے خواب کو حقیقت میں بدل سکتے ہیں اور اقبال کے اس شکوے کا جواب بھی دے سکتے ہیں، جس میں آپ نے کہا تھا: ''مسلمان ایشیائی سیاست کی تعمیر و ترقی

(1) The future of Islam in India is largely depends, in my opinion, on the freedom of peasants in the Punjab. (ایضاً، ص ۴۱)

میں کوئی بھی (ڈھنگ کا) کام کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔[1]

ہمیں جنوب ایشیاء کے دائرے میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا کی تنظیم O.I.C. کو بھی صحیح معنی میں منظم اور فعال تنظیم بنانا ہوگا۔ پترا جایا میں حال ہی میں اس تنظیم کا جو اجلاس ہوا ہے، ہر چند اس میں بعض مسلم رہنماؤں نے مثبت اور مؤثر تقریریں کی ہیں۔ لیکن مسلم رہنماؤں کے اس اہم اجلاس نے یہ نہیں بتایا کہ مسلم دنیا کے خلاف اینگلو امریکن سیاست اور اسرائیل نے جو روّیہ اختیار کر رکھا ہے، اس سے کیوں کر نپٹا جائے۔ سب سے پہلے افغانستان اس سامراجی سیاست کا شکار ہوا، پھر عراق اور اب ایران اور شام کی طرف سیلابِ بلا رُخ کرنے والا تھا کہ عراق میں اہلِ عراق نے مزاحمت کا جھنڈا بلند کر دیا، جس پر خود برطانیہ اور امریکہ میں اینگلو امریکن جارحیت اور بش اور ٹونی بلیر سخت تنقید کا نشانہ بنے، فرانس اور جرمنی نے مسئلہ عراق پر کھل کر امریکہ و برطانیہ کی پالیسی سے اختلاف کیا، جس کی وجہ سے ایران اور شام سردست اینگلو امریکن سیاست کا نشانہ نہیں بنے۔

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی خبر کئی سال پہلے امریکہ کے سابق صدر نکسن (Nixon) نے اپنی کتاب "Seize the Moment" میں دی تھی۔ اس میں صدر نکسن نے لکھا تھا کہ ''صدام حسین نے اگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر حملہ کر کے نئے عالمی نظام (New World Order) سے وابستہ اُمیدوں پر ضرب کاری لگائی تھی۔'' (ص ۲۹) اور یہ بھی لکھا تھا کہ کمیونزم کی شکست کے بعد ''تاریخ میں پہلی بار یہ حقیقی موقع ملا ہے کہ اگلی صدی (۲۱ ویں) کو امن، آزادی اور ترقی کی صدی قرار دیا جائے۔ اس منزل پر پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی قوم رہنمائی فراہم کر سکتی ہے اور وہ ہے 'ریاست ہائے متحدہ امریکہ'۔ سچائی کی یہ گھڑی آن پہنچی ہے، اس گھڑی کو پکڑنا ہمارا فرض ہے۔'' (ص ۴۰)

صدر نکسن نے اپنی کتاب میں ایک دوسری کتاب: The Age of Faith کے حوالے سے بغیر کسی تحفظ کے مسلم دنیا کے عظیم کلاسیکی دانشمندوں کی تعریف کی ہے، جنہوں نے

(1) "The Muslim conquerors consequently failed to do anything for the political improvement of Asia." (ایضاً، ص ۱۲۰)

اسلامی تہذیب کو آگے بڑھانے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ماضی میں مسلم دنیا کی کامیابیوں کا ذکر کرنے کے بعد نکسن لکھتے ہیں: ''یہ کامیابیاں اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ مسلم دُنیا مستقبل میں بھی تہذیب کے کسی اعلیٰ مقام پر فائز ہوسکتی ہے، بشرطیکہ سیاسی عدم استقرار اور تباہ کن جنگوں کے چکر پر قابو پالیا جائے۔'' (ص ۱۹۹) مشرقِ وسطیٰ کے اُمور پر تبصرہ کرتے ہوئے اُنہوں نے مزید لکھا:

''ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم خلیج فارس کی سلامتی اور عرب اسرائیلی تصادم — جو مزید خون ریزی کی دھمکی دے رہے ہیں — سے متعلق مسائل کا حل تلاش کریں۔ جب تک ان چیلنجوں کا سامنا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ تہذیب کا گہوارہ (مشرقِ وسطیٰ) خود اپنی ہی قبر بن سکتا ہے — مشرقِ وسطیٰ میں ہمارے دو فوری مفاد — پٹرول اور اسرائیل — ہمیشہ پوری طرح سے اکٹھے نہیں رہ سکتے۔'' (ص ۲۱۷)[1] صدر نکسن کو کیا پتہ تھا کہ اس کے اپنے ہی جانشین بزعمِ خویش مشرقِ وسطیٰ کو قبرستان بنانے کی سعیٔ مذموم کریں گے۔

مسلمانوں سے تعاون کا ذکر کرتے ہوئے صدر موصوف نے کتنا صحیح لکھا ہے:

''ہماری پالیسیوں کو ترتیب دیتے وقت ہمیں ابتداء احترام اور مسلمانوں کو سمجھنے سے کرنی چاہیے۔ مسلمان یہ احساس رکھتے ہیں کہ انہیں اب تک غلط سمجھا گیا ہے، ان کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے اور مغربی طاقتوں نے ان کا استحصال کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان پر اپنی قدریں مسلط نہ کریں۔ ہر چند مسلم دنیا سیاسی ترقی میں مغرب سے پیچھے ہے۔ صرف دو مسلم قومیں ایسی ہیں جہاں جمہوری حکومتیں قائم ہیں۔ ہماری تہذیب فطری طور پر ان کی تہذیب سے بلند نہیں، مسلم دنیا کے لوگ مغرب کی بہ نسبت کمیونزم کے زیادہ خلاف تھے۔ ایسے ہی مادیت اور جنسی تعلقات کے بارے میں مغربی کلچر کے لبرل یا آزادانہ رویہ کو مسترد کرنے کا اعزاز (Credit) بھی مسلمانوں کو جاتا ہے۔ (ص ۲۳۰) یہی وہ قوم ہے، جس نے پانچ سو سال تک (ساتویں تا بارہویں صدی) ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے معاشرت، مذہبی رواداری، فلسفہ،

(1) "Our two immediate interests in the Middle East--- Oil and Israel--- are not always fully compatible." (p. 217).

سائنس اور کلچر کے میدان میں عیسائی دنیا کی قیادت کی تھی۔'' کیا صدر بش اور وزیراعظم ٹونی بلیر صدر نکسن کے اس مشورہ پر غور وفکر کرنے کی زحمت فرمائیں گے؟

الغرض اس کتاب کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نکسن اپنے سے بعد میں آنے والے صدور، خاص طور پر صدر بش سے کہیں زیادہ تاریخی بصیرت رکھتے تھے اور مسلم دنیا کا تعاون حاصل کرنے کے لیے باہمی احترام، مہذب اور باوقار طرزِ عمل کے قائل تھے۔

بے شبہ صدر نکسن کی خواہش تھی کہ دنیا میں سویت یونین کی شکست کے بعد امریکہ ہی ایک عظیم طاقت ہے، جو آج کی دنیا میں آزادی اور امن کا کردار ادا کرسکتی ہے۔ لیکن نہایت ہی دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آنجہانی صدر کے جانشینوں — خاص طور پر صدر بش اور ٹونی بلیر — نے اپنے سیاسی کردار کے لیے جو راہ اختیار کی ہے، وہ اینگلو امریکن دانشمندوں، فلسفیوں اور مدبروں کی راہ نہیں ہے، جنہوں نے ادب، فلسفہ، اخلاق، قانون اور سیاست میں قابلِ قدر فکری سرمایہ چھوڑا ہے، جس پر نہ صرف اینگلو امریکن اہلِ فکر بلکہ تمام دنیا کے اہلِ نظر فخر کرسکتے ہیں۔ افسوس! آج صدر بش اور وزیراعظم ٹونی بلیر اپنی فکری میراث سے ہٹ کر جس راہ پر چل رہے ہیں، اس پر چل کر چنگیز خان کے جاں نشینوں نے کل بغداد میں انسانیت اور مسلم تہذیب وتمدن کو ویران کیا تھا۔ آج بغداد میں اینگلو امریکن سیاست بھی شعوری یا لاشعوری طور پر وہی کچھ کر رہی ہے، جسے کل تاتاریوں نے بغداد میں کیا تھا!! ہم یہاں ان دونوں مغربی رہنماؤں سے بہ صد ادب یہی کہہ سکتے ہیں:

ع تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن!

رشید احمد (جالندھری)